اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ ادب

مدیر

رانا عبدالرزاق خان

rana_razzaq@hotmail.com

07886304637 & 02089449385

معاون مدیر و ڈیزائنر:

عامر امیر

07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ:

ایاز احمد راٹھور

www.bazmesherosukhan.co.uk

ماہنامہ قندیلِ اَدب انٹرنیشنل لندن مارچ ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر ۱۵

مجلس ادارت ۔ مبارک صدیقی،
زکریا ورک،، خواجہ عبدالمومن ناروے،
راجہ منیر احمد،
مدیر اعلیٰ ۔ بشیر احمد رفیق لندن۔
مدیر ۔۔۔ رانا عبدالرزاق خان
معاون مدیر ۔ سید حسن خان، عبدالمجید ظفر
مدیر خصوصی ۔۔ سہیل لون
ڈیزائنر ۔ عامر مجید
مینجنگ ڈائریکٹر ۔ عاصی صحرائی
فوٹو گرافی ۔ قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
اراکین مشاورتی بورڈ، آدم چغتائی
،منور احمد کنڈے، اقبال مجیدی، میاں فہیم الدین
،تنویر احمد آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین،

وضاحت۔ قندیلِ اَدب انٹرنیشنل کسی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے اِمتیاز سے بالاتر ہے یہ صرف اُردو اَدب کی ترقی و ترویج کے لئے جاری کیا گیا ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضامین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفحات حاضر ہیں۔ تحریر کے ساتھ اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے

گزارش

قندیلِ ادب کے قارئین کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس ماہنامے کو ہر اعتبار سے معیاری، دیدہ زیب، منفرد، معتبر بنانے کی کوشش مسلسل شب و روز جاری ہے۔ برائے مہربانی اس سلسلہ میں اپنی گراں قدر آراء اور مشوروں سے نوازتے رہیں۔ عالمی امن و آشتی اور علم و ادب کی ترویج کے لئے مضامین بھیجتے رہیئے۔ ماہنامہ قندیل اَدب اشاعت کے سلسلے میں تن تنہا و اُفتاں و خیزاں بے یار و مدد گار متعدد مالی دُشواریوں کے باوجود خدمتِ اُردو اَدب میں ایک سال سے مصروفِ عمل ہے۔ اور اب سابقہ پندرہ شماروں کا ایک سالنامہ تیار کر کے چھپوانے کا پروگرام ہے۔

اگر شائقین اس میں دلچسپی لیں اور اپنی کاپی بک کروالیں تو ادارے کو آسانی رہے گی۔ اس پندرہ شماروں کے مجموعے کی قیمت دس پونڈ ہوگی۔ اس کی بکنگ کے لئے آپ کو مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں رقم ارسال کرنی ہوگی۔

ABDULRAZZAQ KHAN

BANK NAME HSBC A/C 04726979

SORT CODE 40-05-00

۔آپ کی محبت، تعاون کا بندہ منتظر رہے گا۔ نیز اپنی آراء اور

مضامین ضرور بھیجتے رہیئے ۔یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔اس کی ترقی میں آپ کا تعاون درکار ہے خدا تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔آمین

فہرست

آپ کے خطوط

عبیداللہ علیم.....غزل

منور احمد کنڈے.....غزل

وسیم فرحت کارنجوی.....غزل

جمیل اختر شفیق.....غزل

ندیم ہاشمی.....غزل

ڈاکٹر وزیر آغا.....غزل

منیر نیازی.....غزل

احمد ندیم قاسمی.....غزل

اقبال عظیم.....غزل

خاطر غزنوی.....غزل

صہبا اختر.....غزل

حبیب جالب.....غزل

سُرور بارہ بنکوی.....غزل

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے.....اشعار

یورپ کے شوہر.....بی اے رفیق

تلاش گُم شدہ.....فضل عمر ڈوگر

بے بسی.....رانا بلال افتخار

محبت کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فراز حمید خاں

سانپ نامہ.....عبدالقدیر کوکب

زندگی.....سید حسن خان

باتوں سے خوشبو آئے.....اعزاز لطیف خاں

مشہور اشعار.....چوہدری نفیس احمد

ابلیس کا جواب.....شیراز وحید خاں

سنہری مشورے.....اے آر راجپوت

ادب کا مذاہب سے تعلق.....عامر مجید

آزادی.....راجہ منیر احمد

منور احمد کنڈے.....غزل

ایک ذیلی یادداشت.....راجہ منیر احمد

ضامن جعفری.....ٹیکس کلچر

عاصی صحرائی.....میرا وطن

علامہ سر محمد اقبال کی شادیاں.....محمد طارق غازی

دہریہ.....افسانہ.....منیزہ جمال

ڈاکٹر عبدالسلام.....مجاہد کامران

آپ کے خطوط

محترم عبدالحئ بشارت کنیڈا سے لکھتے ہیں؛۔

محترم رانا صاحب.....السلام و علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا ماہنامہ ''قندیلِ ادب'' نظر سے گزرا۔ماشاءاللہ بہت عمدہ کاوش ہے۔اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر توفیق عطا فرمائے۔ادبی دنیا میں یہ ''قندیلِ ادب'' کے متوالوں کے لئے چراغِ راہ منزل بن جائے۔اس کی مشاورتی ٹیم میں بڑی بڑی قدآور شخصیات شامل ہیں۔جس سے ایک امید بندھتی نظر آتی ہے کہ اس کی باقاعدگی سے اشاعت،اس کا ادبی معیار،تاریخی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ، اچھے اور نئے اور پرانے شعراء کے کلام سے آراستہ ایک لمبا سفر طے کرے گا۔مجھے یقین ہے کہ اس ماہنامہ کو نئی نسل میں بھی سرعت کے ساتھ روشناس کرایا جائے گا۔کیونکہ اب وہ ہی اس ادبی اولمپک فلیم کو لے کر آگے بڑھنے والے ہیں۔والسلام:عبدالحئ بشارت کنیڈ

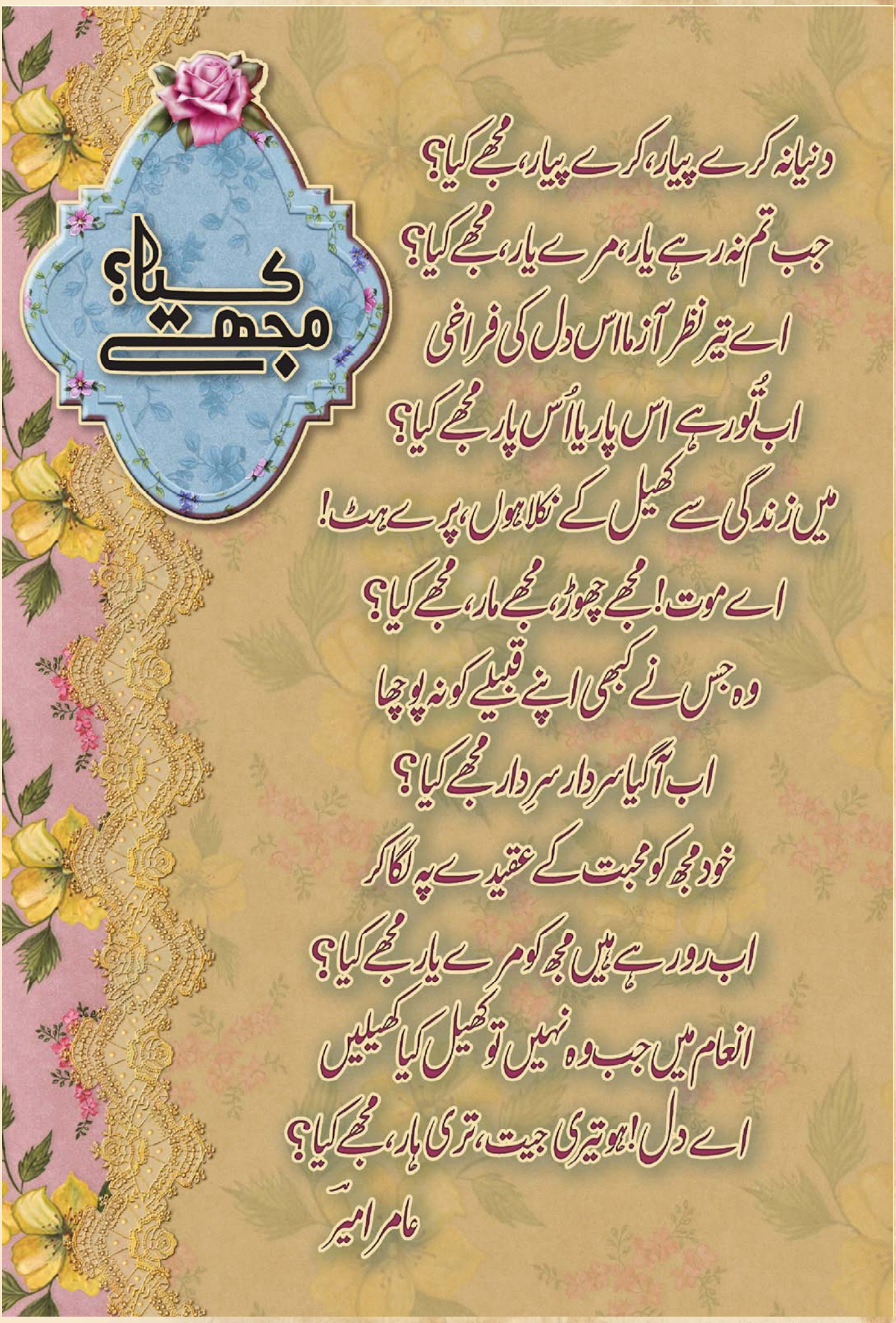

مجھے کیا؟

دنیا نہ کرے پیار، کرے پیار، مجھے کیا؟
جب تم نہ رہے یار، مرے یار، مجھے کیا؟

اے تیر نظر آزما اس دل کی فراخی
اب تُو رہے اس پار یا اُس پار مجھے کیا؟

میں زندگی سے کھیل کے نکلا ہوں، پرے ہٹ!
اے موت! مجھے چھوڑ، مجھے مار، مجھے کیا؟

وہ جس نے کبھی اپنے قبیلے کو نہ پوچھا
اب آ گیا سردار سرِ دار مجھے کیا؟

خود مجھ کو محبت کے عقیدے پہ لگا کر
اب رو رہے ہیں مجھ کو مرے یار مجھے کیا؟

انعام میں جب وہ نہیں تو کھیل کیا کھیلیں
اے دل! ہو تیری جیت، تری ہار، مجھے کیا؟

عامر امیرؔ

عبیداللہ علیم

سایہ سایہ ایک پرچم دل پہ لہرانے کا نام
اے مسیحا،تیرا آنا زندگی آنے کا نام
لاکھ فریادی رہے دیوارِ گریہ پر ہجوم
جانے والا اب نہ لے گا لوٹ کر آنے کا نام
جس پہ اُترا وہ مسیحا،دل منارہ ،دل دمشق
استعارے پھول میں خوشبو کو سمجھانے کا نام
وہ اندھیروں میں عجب اک روشنی کا خواب ہے
وہ اُجالوں میں چراغ ِ نور لہرانے کا نام
جب سے آیا ہے دل کی اور دنیا ہو گئی
ورنہ پہلے دل تھا گویا ایک ویرانے کا نام
کیوں نہ وہ قامت قیامت ہو ،کہ ہے اس کا وجود
رات کے جانے کا نام،اک صبح کے آنے کا نام

وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)

کسی نظر میں سماؤں وہ ولولہ بھی دے
نکھار، بخشا ہے تو نے ،تو آئینہ بھی دے
تمام لفظ ہی خاموش،مصلحت کے شکار
زبان دی ہے، تو کہنے کا حوصلہ بھی دے
گمان و وہم کے درمیاں تھک کے بیٹھ گیا
کہاں تلاش کروں ، کچھ اتا پتہ بھی دے
نفس نفس کی اذیت سے بات کیا بنتی
میرے عزیز!! مجھے زخم جاں فزا بھی دے
مرا خلوص ترے مکروفن سے ہار گیا
کہاں عذابِ مکرر!! مجھے ہٹا بھی دے

جمیل اختر شفیق

کتنے جذبات کو سینے میں چھپا رکھا تھا
زندگی ہم نے تجھے خوب سجا رکھا تھا
جس کو حالات کی آندھی نے اُٹھا رکھا تھا
اس کا اس دل نے کبھی نام حیا رکھا تھا
مدتوں ہم نے تجھے دل کے نہا خانوں میں
اپنے احساس کی چادر سے چھپا رکھا تھا
جب کبھی مجھ پہ تیرے ہجر کی وحشت چھائی
تیری تصویر کو سینے سے لگا رکھا تھا
تم نے دیکھا ہی نہیں ورنہ امیدوں کی گلی میں
ٹمٹماتا ہوا اک اور دیا رکھا تھا

ندیم ہاشمی

میری آنکھوں نے جو منظر دیکھے
ایسا لگتا ہے سمندر دیکھے
ایک صورت ہے جھلملاتی ہوئی
اِ ک ستارہ ہے جو شب بھر دیکھے
آرزو ہے کہ کبھی چاند کوئی
بام سے اپنے اُتر کر دیکھے
کتنے خوابوں کو یہ تمنا ہے
آئینے میں وہ سنور کر دیکھے
حُسن کی آنکھ جہاں روشن ہو
دلِ بے تاب برابر دیکھے
کیا زمانے میں رَوش اُتری ہے
وہ جو دلبر تھے، ستمگر نکلے

ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا

سارا بدن لہو کا رواں مُشتِ پر میں تھا
جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا
حدِ اُفق پہ شام تھی خیمے میں منتظر
آنسو کا اِک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا
لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو ایک کوہِ گراں رہگزر میں تھا
پاگل سی اک صدا کسی اُجڑے مکان میں تھی
کھڑکی میں اِک چراغ بھری دوپہر میں تھا
اُس کا بدن تھا خون کی حدت میں شعلہ پوش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

منیر نیازی

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
یہ اجنبی سہی منزلیں اور رفتگان کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
لائی ہے اب اُڑا کے نئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو
پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو
شامِ الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

ناصر کاظمی

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچہء دلبر ہی لے چلیں
یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی،
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں
اس شہر بے چراغ میں جائے گی تُو کہاں
آ اے ،شبِ فراق ، تجھے گھر ہی لے چلیں

احمد ندیم قاسمی

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے
کوہِ غم پر سے جو دیکھوں تو مجھے
دشتِ آغوشِ فنا لگتا ہے
سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے
مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا مجھ کو خدا لگتا ہے
نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں گِلہ لگتا ہے
اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے
اس قدر تُند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

اقبال عظیم

یہ نگاہ جھکی جھکی، یہ جبینِ ناز دھواں دھواں
مرے بس کی اب نہیں داستاں، مرا کانپتا ہے رُواں رُواں
یہ تخیلات کی زندگی، یہ تصورات کی بندگی
فقط اک فریب خیال پر مری زندگی ہے رواں دواں
مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ باحتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں وہ خلوص ربط نہاں نہاں
نہ سفر بشرط مآل ہے نہ طلب بقید سوال ہے
فقط ایک سیریء ذوق کو میں بھٹک رہا ہوں کہاں کہاں
ہو طلسمِ عالمِ رنگ و بُو کہ حریمِ انجم و کہکشاں
مرا ساتھ دے گی نظر مری وہ چھپیں گے جا کے جہاں جہاں
مری خلوتوں کی یہ جنتیں کئی بار سج کے اُجڑ گئیں
مجھے بارہا یہ ہوا گماں کہ تم آرہے ہو کشاں کشاں

خاطر غزنوی

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا ،کچھ لوگ پہچانے گئے
گرمیء محفل فقط اک نعرہ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے
میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رُسوائی کہوں
مجھ سے پہلے،اس گلی میں میرے افسانے گئے
یوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دھند میں لیکن نہ پہچانے گئے
وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے، ہمارے ساتھ ویرانے گئے
اب بھی ان یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے
کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتہء شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

صہبا اختر

آجا، اندھیری راتیں تنہا بِتا چکا ہوں
شمعیں جہاں نہ جلتیں، آنکھیں جلا چکا ہوں
خورشیدِ شامِ رفتہ لوٹے ،تو اس سے پوچھوں
میں زندگی کی کتنی صبحیں گنوا چکا ہوں
اُمید بیم و شب نے یہ بھی بھلا دیا ہے
کتنے دیئے جلائے ،کتنے بُجھا چکا ہوں
میں باز گشت دل ہوں پیہم شکستِ دل ہوں
وہ آزما رہا ہوں ، جو آزما چکا ہوں
یہ شب بُجھی بُجھی ہے ،شاید کہ آخری ہے
اے صبح درد، تیرے نزدیک آچکا ہوں
مجھ کو فریب مت دو،اے موسمِ بہاراں
ایسے کئی شگوفے میں بھی کِھلا چکا ہوں
سورج طلوع ہوں یا سورج غروب صہبا
شبہائے غم کے پردے خود گرا چکا ہوں

حبیب جالب

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِ راہ گزر ہیں
حیرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سُو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں
آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند ،وہ سورج،وہ شب و روز کدھر ہیں

سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہرواں! کیا یہی اندازِ سفر ہیں؟
وہ لوگ ،قدم، جن کے لئے کاہکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہم نفسو! ہم سے بشر ہیں
بِک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ لعل و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں،ہم نُورِ سحر ہیں

سُرور بارہ بنکوی

یہی نہیں کہ مرا دل ہی میرے بس میں نہ تھا
جو تُو ملا تو میں خود اپنی دسترس میں نہ تھا
یہ نامِ عہدِ رفاقت بھی ہم قدم نہ ہوا
یہ حوصلہ مرے معصوم ہم نفس میں نہ تھا
عجیب سحر کا عالم تھا اُس کی قربت کی
وہ میرے پاس تھا اورمیری دسترس میں نہ تھا
نہ جانے قافلہ ء اہلِ دل پہ کیا گزری
یہ اضطراب کبھی نالۂ جرس میں نہ تھا
خبر تو ہوگی تجھے تیرے جاں نثاروں کی
کوئی تو تھا سرِ مقتل جو پیش و پس میں نہ تھا
سُرور اپنے چمن کی فضا ہے کیا کہیئے
سکوت کا تو وہ عالم ہے جو قفس میں نہ تھا

انتخاب

جون ایلیا

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم
یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم
ہماری بھی تمنا کیوں کرو تم
تمہاری بھی تمنا کیوں کریں ہم
کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم
برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

حسن عباسی

وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقین
پھر ہوا یوں کہ مر کر دکھانا پڑا مجھے
اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل سے سب سے ہاتھ ملانا پڑا ہمیں
ایسے بچھڑ کے اس نے تو مرجانا تھا حسن
اُس کی نظر میں خود کو دکھاناپڑا ہمیں

خورشید رضوی

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اُتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

راشدہ اُداس

لکھتا تو ہے وہ خط مجھے چاہت بھرا مگر
ہوتا ہے یہ کمال بڑی مدتوں کے بعد
اُس کو جواب دینے کی جلدی مجھے ہے کیوں
جس نے کیا سوال بڑی مدتوں کے بعد
لکھا ہے اس نے خط میں کہ آؤں گا اگلے سال
گزرے گا اب یہ سال بڑی مدتوں کے بعد

رشید قیصرانی

سوچوں بھی اب اُسے تو تخیل کے پر جلیں
مجھ سے جدا ہوا تو جدا ہوگیا وہ شخص
پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کر اُسے رشید
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہوگیا وہ شخص

سلیم احمد

عشق میں جس کے یہ حال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

سید امتیاز احمد

گو یاد میر جی کی نصیحت کیا کریں
بے زوروزر ہیں اور محبت ہے کیا کریں
ہم لوگ صرف عشق ہی کرتے ہیں چھوڑ دیں
چھوڑا، اب جو اتنی فراغت ہے کیا کریں
ہم جانتے ہیں ہم سے بُرا کوئی بھی نہیں
پر یہ جو ہم کو اچھوں سے نسبت ہے کیا کریں
آخر کو ہم نے دعویٰ فقروغنا کیا
بیچارگی کا نام قناعت ہے کیا کریں

شکیب جلالی

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ کیوں دکھائی دیتا ہے

ظفر اقبال

آگے بھی عشق میں ہوئیں رُسوائیاں مگر
اب کے وفا کا زخم جبیں پر لگا مجھے

لطیف ساحل

جو بات بات پہ تکرار کرنے والا تھا
وہ شخص مجھ کو بہت پیار کرنے والا تھا
تری سواری تلے آکے مر گیا ہے جو
ترا قریب سے دیدار کرنے والا تھا
خطا یہ ہے کہ چھپ چھپ کے تیرا نام لیا
یہ جُرم تو سرِ بازار کرنے والا تھا

قتیل شفائی

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکراکے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

یورپ کے شوہر۔۔۔مرسلہ۔۔بشیر احمد رفیق

شوہر جی اُٹھو، گھر سے نکلو، شادی کا سوگ منانا کیا
جو ہونا تھا وہ ہو کے رہا،اب دل کو اور جلانا کیا
بیوی کی زباں درازی سے جھنجھلاتے ہو ،گھبراتے ہو
جب شادی کر ہی بیٹھے ہو تو پھر اب شور مچانا کیا
کوٹ کی ساری جیبوں میں ڈھونڈو تو سہی،دیکھو تو سہی
اک دس کا نوٹ ہی مل جائے تو ہاتھ اپنا پھیلانا کیا
شب بیتی،چاند بھی ڈوب گیااب پاؤں دبانا بند کرو
اُٹھو جلدی سے آٹا گوندھو،تمہیں ناشتہ نہیں بنانا کیا
شادی ہوئی ، آزادی چھنی زنجیر پڑی اب پیروں میں
میاں آنکھیں لڑانا بند کرو ،اب ہنسنا اور ہنسانا کیا
اب تم شوہر ہو ،حد میں رہواور آنکھ مٹکانا جانے دو
بیوی کے قہر کو دعوت نہ دو تمہیں لوٹ کے گھر نہیں جانا کیا
لو بھور بھائی، اب اُٹھ بیٹھو ،چائے کا پانی رکھو جا کر

بیوی کو اگر چائے نہ ملی تو رات کو کھاؤ گے کھانا کیا

لذتِ اظہار

پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی سابق پروفیسر، اقبال چیئر کلکتہ کے خیال میں ۔۔۔آدم چغتائی کی شاعری

آدم چغتائی ایک شائستہ، متین، وضعدار اور تَرشے ہوئے آدمی ہیں۔ان کی شاعری میں ان کے شخصی اوصاف شائستگی، متانت، پاسِ روایت اور تراشیدگی کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ایک نیک خو انسان کے افکار و جذبات میں جو پاکیزگی اور خوش خصلتی ہونی چاہیئے۔کلامِ آدم چغتائی میں اس کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔مجھے موصوف کی غزلیہ لہجے کی معصومیت اور سادگی نے خاص متاثر کیا۔نغمگی اور گھلاوٹ، خلوص اور خود سپردگی بھی ان کی غزل کے نمایاں اوصاف ہیں۔ان کا تازہ مجموعہ کلام ''جستجوئے جمال'' منظر عام پر آیا چاہتا ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

تلاشِ گم شدہ۔ ہم سے ''خلوص'' گم ہو گیا ہے۔اُس کی عمر سو سال ہے بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔گھر میں خود غرضی کا ماحول اور اَن بَن ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا ہے شنید ہے کہ ہمدردی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ابھی تک دونوں کی خبر نہیں۔اُس کے بھائی ''اُخوت اور بہن حُبالوطنی'' اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔اُس کا بھائی اُخوت بہت ہی پریشان ہے۔اس کے جانے کے بعد اس کی بہن شرافت کا انتقال ہو گیا ہے۔شرافت کے غم میں حیا بھی بستر مرگ پر پڑی ہے۔اس کے والد ''معاشرہ صاحب'' کو سخت فکر لاحق ہے اور ماں ''انسانیت'' بھی سخت بے قرار ہے۔وہ آخری بار اپنے جگر گوشے کو دیکھنا چاہتی ہے۔جس کسی کو ملے براہِ مہربانی پاکستان واپس پہنچا دے۔''خلوص'' اگر خود پڑھے تو واپس آجائے۔پاکستانی لوگوں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔

بے بسی

بے بسی ایسا لفظ ہے جو اپنے اندر بے حد لاچاری سمیٹے ہوئے ہے۔انسان زندگی میں کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے کہ صلاحیتوں اور قابلیت کے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا۔یہ صبر کا دامن ہی ہے جو بے بسی کے آنسو صاف کر دیا کرتا ہے کیونکہ صبر کرنے سے خدا کا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔جس کے ساتھ اللہ ہو اسے اور کیا چاہیئے۔امتحان کے بعد صبر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

محبت کیا ہے؟

محبت کے چار حروف انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ محبت ایک بہت پیارا جذبہ ہے۔محبت کبھی زبردستی نہیں کروائی جا سکتی۔البتہ یہ خود ہم پر حاوی ہونے کی طاقت رکھتی ہے۔محبت کے بہت رُوپ ہیں بعض بہت سُندر بھی ہیں اور کچھ بھیانک بھی۔محبت کو سمجھنا انسان کے بس میں نہیں محبت اگر اللہ سے ہو تو دنیا و آخرت سنور جاتی ہے ہم بہت پُر سکون رہتے ہیں۔کچھ ایسا ہی حال والدین اور بہن بھائیوں کی محبت کی صورت میں انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔میاں بیوی اور بچوں کی محبت کا اپنا ہی ایک حسن ہوتا ہے۔ یہ تمام محبتیں ہمارے لئے زندگی کا خوبصورت احساس بن جاتی ہیں ۔ہمیں اپنے ان رشتوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ہمیں ان کی خوشیوں کے جو کرنا ہو کرتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں باقی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں

سانپ نامہ۔ سانپ کا نام لیتے ہی ہم پر عجیب خوف سا طاری ہو جاتا ہے۔ہمیشہ سے ہی سانپ اور انسان ایک دوسرے کے دشمن

متصور ہوتے ہیں۔ ویسے آج کل تو انسانوں کے اندر ایک دوسرے کے لئے اتنی نفرت اور کدورت ہے کہ سانپ کے زہر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بھائی بھائی کو ڈس رہا ہے۔ انسان انسان کو زہریلے پن سے پیش آتا ہے لیکن ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح سانپوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی کی بہو تیز اور ساس سخت مزاج ہو تو کہتے ہیں وہ تو ناگن مزاج ہے۔ اسی طرح فلم انڈسٹری پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ ناگ اور ناگن پر کافی فلمیں بنی ہیں جو کہ کافی مقبول ہوئیں۔ مگر عرصہ ہو گیا سانپ انسانوں کی بستی سے دور چلے گئے ہیں یہ سوچ کر کہ انسان انسان کی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ دوسرے انسانوں کو سسکتے ہوئے مرتا دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے تو وہاں ہماری کیا ضرورت ہے۔ یہی سوچ کر سان پوں نے انسانوں کی بستیوں کو چھوڑا کہ یہ کافی ہیں ایک دوسرے کو ڈسنے کے لئے۔

زندگی

زندگی جس پر ہمیں اتنا ناز ہے جو صرف چند سانسوں کی کہانی ہے۔ زندگی کا مفہوم سمجھتے سمجھتے ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ زندگی ایک بہت خوبصورت کتاب ہے جسے بہت کم لوگ پڑھنا جانتے ہیں۔ زندگی کا وقفہ اگر خوشی ہو تو بہت قلیل اگر مصیبت ہو تو یہی بہت طویل دکھائی دیتا ہے زندگی ایک مانگا ہوا زیور ہے جسے قربان کرنا اذیت ناک ہے۔ زندگی ایک سراب ہے جس کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں اور موت حقیقت ہے جسے ہم فراموش کئے ہوئے ہیں۔

باتوں سے خوشبو آئے۔ جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے اس کی سلامتی اس کے قبضے میں ہے۔ آہستہ بولنا، نیچی نگاہ رکھنا، میانہ چال چلنا، ایمان کی نشانی ہے۔ اگر تم بادشاہ ہو تب بھی اپنے والد اور استاد کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ کسی سے اس طرح جھگڑا مت کرو کہ مصالحت کی گنجائش نہ رہے۔ تحریر ایک خاموش زبان ہے اور قلم ہاتھ کی زبان۔ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ کسی کی دل آزاری ہے چاہے وہ مومن کی ہو یا کافر کی۔

چند شعراء کے مشہور اشعار

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دُشمنِ دیں راحتِ جاں ٹھہری ہے

فیض احمد فیض

ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

فیض احمد فیض

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گُلِ پیرہن تک
قدو گیسو سے اپنا سلسلہ دارو رسن تک ہے

مجروح سلطان پوری

کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو دن رات سنوارا کرتے ہیں

معین احسن جذبی

ساقی و بادہ نہیں جام و لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

اختر الایمان

ترے گیسو، تری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

جاں نثار اختر

اے چارہ گرانِ عصرِ حاضر
فولاد کا دل کہاں سے لاؤں

احمد ندیم قاسمی

عقل ہر بار دکھاتی تھے جلے ہاتھ اپنے
دل نے ہر بار کہا آگ پرائی لے لے

احمد فراز

موجیں ہیں مئے سُرخ کی یا خطِ دہن ہے
لب ہیں کہ کوئی شعلہ برگ علمی ہے

فراق گورکھپوری

ترا غم تو مری جانِ تمنا
تری صورت سے بڑھ کر دلرُبا ہے

نریش کمار شاد

دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدہء شب یاد آیا

ناصر کاظمی

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھر تھراتی رہی رات بھر

مخدوم محی الدین

اس حسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا شرمائے ہوئے رہنا

منیر نیازی

اِک عرضِ وفا بھی نہ کر سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی، وہاں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

مجاز لکھنوی

جگر آسان نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

جگر مرآبادی

ابلیس کا جواب.....

ایک ولی نے ابلیس کو دیکھا تو پوچھا....
''دنیا میں کوئی ایسا انسان بھی ہے جو تیرے شر سے محفوظ رہتا ہو؟''
ابلیس نے جواب دیا۔''ہاں میں نے تین قسم کے انسانوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ہے....''
اوّل۔وہ جو اپنی تعریف خود کرے۔
دوم۔وہ جو اپنے چھوٹے سے کام کو بھی بڑا کر کے دکھائے۔
سوم۔وہ جو گناہ کر کے بھول جائے۔

دنیا کے بچے

۱۔فرانس کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی اپنا بستر دیکھتا ہے۔ ۲۔انگلستان کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی اخبار مانگتا ہے اور خدا کی عبادت کرتا ہے۔۳۔جاپان کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی اپنی زمین کا جائزہ لیتا ہے کہ کہیں اس میں دراڑ تو نہیں پڑ گئی۔۴۔افریقہ کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی محنت مزدوری میں جُٹ ہوئے اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتا ہے۔۵۔پاک و ہند کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی روٹی مانگتا ہے نہ ملنے پر چیخنے چلانے لگ جاتا ہے۔۶۔طالبان کا بچہ سویرے اُٹھتے ہی اسلحہ بنانے اور چلانے میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتا ہے

سنہری مشورے

۱۔مجھے اعتراف ہے کہ میں بُروں کے ساتھ زیادہ دیر اچھا نہیں رہ سکتا۔۲۔کانٹوں سے بھری ہوئی ٹہنی کو ایک ہی پھول خوبصورت بنا دیتا ہے۔۳۔جو کام لوگوں کے سامنے کرنا مناسب نہیں وہ چھپا کر بھی نہ کرو۔۴۔ذلّت اُٹھانے سے بہتر ہے کہ تکلیف اُٹھالو۔۵۔بات کو دیکھو بات کرنے والے کو نہ دیکھ۔۶۔جو غور و فکر کرتا ہے وہ حقیقت کو پالیتا ہے۔۷۔عشق، اقتدار اور فرحت میں لوگ بدلتے نہیں ہیں، بے نقاب ہوتے ہیں۔

ادب کا مذاہب سے تعلق۔اے آر۔راجپوت

ا۔عربی زبان کا بہترین ادب قرآن مجید ہے جس کا عرب ادیبوں کو چیلنج ہے کہ وہ سب مل کر اس کی آیات جیسی چند آیات تخلیق نہیں کر سکتے۔۲۔فاسی ادب کا بہترین ادب شاہنامہ ہے جو قدیم ایرانی مذہبی تاریخ پر مبنی ہے۔۳۔یونانی ادب کا بہترین ادیب ہومر ہے۔جس کی اکثر تخلیقات مذہبی ہیں۔جنہیں ایپک کہا جاتا ہے(EPIC)جن میں ILIADاور ODESSEY مشہور نظمیں ہیں۔۴۔اطالویادبکا بہترین نمونہ دانتےDANTE کی مذہبی نظم ڈیوائن کامیڈی DIVINECOMEDY ہے۔۵۔جان ملٹن کی مذہبی نظم پیراڈائز لوسٹ انگریزی ادب کا عظیم نمونہ ہے۔جس میں اس نے خدا کے احکامات کی حکمت انسانوں پر اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔۶۔مہابھارت اور رامائن سنسکرت ادب کے لازوال نمونے ہیں۔۷۔مہاتما گوتم بدھ کے حالات پر مشتمل بدھاسریتاپالی ادب کا عظیم نمونہ ہے جسے اسواگھوش نے دوسری صدی عیسوی میں تخلیق کیا۔۸۔ہندی میں تلسی داس کی رام چرترمانس سے بہتر ادبی تخلیق آج تک سامنے نہیں آئی۔۹۔مراٹھی ادب میں سنت گیانیشور(بھگودگیتا کا ترجمہ)بہترین تخلیق سمجھی جاتی ہے مراٹھی میں دلت ادب موجود ہے جس کا ساہتیہ سمیلن ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

ادبی لطیفہ

جوش ملیح آبادی نے پنجابی کے اکھڑپن سے زچ ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہا"کنور صاحب کیا آپ جانتے ہیں کہ دوزخ کی سرکاری زبان یہی آپ کی پنجابی ہوگی؟"کنور صاحب نے برجستہ جواب دیا"تو پھر جوش صاحب آپ کو ضرور پنجابی سیکھ لینی چاہیئے"

آزادی.....؟ راجا منیر احمد

جج نے مجرم کو سزا سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔تمہیں آزاد کیا جاتا ہے تا کہ تم نوکری کی تلاش میں سارا دن دھکے کھاؤ۔بے روزگاری تمہارا کچومر نکال دے۔کھانے پینے کی اشیاء تمہیں ملاوٹ شدہ اور مہنگی ملیں۔جھوٹے سیاسی لیڈر اور مُلا تمہارا ناطقہ بند کر دیں۔پولیس بابا آوارہ گردی میں تمہارا چالان کرے اور تمہاری راتوں کی نیند اور سکون برباد ہو جائے۔مجرم نے عاجزی سے معلوم کیا..... جج صاحب آپ مجھے آزادی دے رہے ہیں یا بد دعا۔

منور احمد کنڈے

دیئے نمناک ہوتے جا رہے ہیں
مناظر خاک ہوتے جا رہے ہیں
ڈبویا ہے جنہوں نے کشتیوں کو
وہی تیراک ہوتے جا رہے ہیں
جنوں کی کارفرمائی تو دیکھو
گریباں چاک ہوتے جا رہے ہیں
مِٹی جاتی ہے دل والوں کی بستی
بدن پوشاک ہوتے جا رہے ہیں
اُفق کی سمت بڑھتے ہیں پرندے
بڑے بیباک ہوتے جا رہے ہیں
ہوائے شہر کی صحبت میں اب کے
سبھی چالاک ہوتے جا رہے ہیں
کسی کو یاد کرکر کے منورؔ
ارادے پاک ہوتے جا رہے ہیں

ا۔ب۔ناصر

ہر ایک طاقت جو ہے زمینی زمیں کی جانب جھکی ہوئی ہے
بلند و برتر ہے ذاتِ واحد بڑائی آتی ہے آسماں سے
یہ'بعد گیارہ' کے زلزلے ہیں پہاڑ جس نے ہلا دیئے ہیں
نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن وہ تیر نکلا ہے اب کماں سے
جو سر جھکانے کی خُو رکھتے تو گرنا اتنا کٹھن نہ ہوتا
ٹھہر بھی جائے بہار آکر تو پھر بھی بدلے گی وہ خزاں سے
خدا کے غیظ و غضب سے بچنے کا ایک نسخہ ہے دل کا تقویٰ
جو اُس کے در پہ جبیں نہ رکھے اماں پائے گا پھر کہاں سے
کوئی بھی دیں ہو وہ ظلم نا حق نہیں سکھاتا ہے آدمی کو
ہمیں ہے لازم کہ دُکھ نہ دیں ہم کسی کو ہاتھوں سے اور زباں سے

ایک ذیلی یادداشت — عاصی صحرائی

انگریز مورّخ کرنل ٹامسن جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران دہلی میں تعینات تھا۔اپنی یادداشت ''علمائے بغاوت'' Rebellion Clerics (ص۹) میں لکھتا ہے کہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک چودہ ہزار مسلم علماء کو پھانسی دی گئی۔سرسید احمد خاں و مولانا محمد حسین آزاد کا پورا خاندان، مرزا غالب کے تمام اعزو اقارب اسی دوران ختم کئے گئے۔یہ تین سال ہمارے ملک کے سیاہ ترین سال تھے۔اس زمانے کا ایک مورخ سید کمال الدین حیدر حسینی الحسنی، قیصر التواریخ، مطبوعہ ۱۸۹۶ء میں لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار علماء کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔سات دن مسلسل قتل عام جاری رہا۔ٹامسن کے بقول دلی چاندنی چوک سے پشاور تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علماء کی گردنیں نہ لٹکتی ہوں۔''انگریز ان علمائے حق کو خنزیر کی کھال میں لپیٹ کر جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیتے تھے۔لاہور کی شاہی مسجد میں پھانسی گھر قائم کیا گیا تھا۔اور ایک دن میں دو دو سو علماء کو پھانسی دے دی جاتی تھی۔ٹامسن لکھتا ہے کہ وہ دہلی کے ایک خیمہ میں مقیم تھا کہ ایک تیز ہوا کا بھبوکا آیا جو کہ نہایت ہی بدبو دار تھا۔اس نے باہر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تیز آگ کے انگارے دہک رہے ہیں۔اور ان پر چالیس علماء کو ننگے بدن اس پر ڈال دیا گیا ہے۔اس کے بعد مزید چالیس علماء کو لایا گیا اور ان کے کپڑے اُتار کر ایک افسر نے کہا ''مولویو! جس طرح انہیں آگ میں جلایا گیا اسی طرح تمہیں بھی جھونک دیا جائے گا۔تم میں سے اگر ایک آدمی یہ کہہ دے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی غداری میں یہ سب لوگ شامل نہ تھے تو تم سب کو چھوڑ دیا جائے گا۔۔ٹامس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے: ''میں نے دیکھا چالیس لوگ آگ میں زندہ بھون دیئے گئے اور اس کے بعد پھر ایسا ہی ہوا مگر کسی نے زبان تک نہ ہلائی''۔کاش میرے وطن کے ملائے طالبان کا بھی یہی علاج ہو

(الہدیٰ انٹرنیشنل کیا ہے، کراچی ۱۴۲۲ھ ص ۵۱۔۵۰۔بحوالہ ماہنامہ دیوبند جنوری تا مارچ ص ۹۹)

ٹیکس کلچر۔۔۔۔۔ضامن جعفری

ٹکس چور کے لئے دہر میں مشہور ہیں ہم
سال ہا سال کی عادات سے مجبور ہیں ہم
راہ گُم کردہ ہیں منزل سے بہت دور ہیں ہم
بسکہ پابندی ء وقت سے مجبور ہیں ہم
راس آیا نہ کبھی ٹیکس کا یہ قہر ہمیں
اور اس شعبے کا ہر فرد لگا زہر ہمیں
جان پہ کھیل کے کی ہم نے ہیرا پھیری
یہ کہیں، اتنی کمائی میں سے آدھی میری
میری نیت کو نہ ہو پائی جو تجھ سے سیری
اب ساحل نہ پہنچ پائے گی کشتی تیری

بھول جا چھوڑ دے سرکار میں کیا رکھا ہے
حاضر و غیب میں سے کس کو روا رکھا ہے
ملک میں چاروں طرف ٹیکس کا کلچر ہے یہ
بچ کے کہاں جاؤ گنبد بے در ہے یہ
بیر مت رکھنا، مگر مچھ سے، سمندر ہے یہ
در بدر ہوگے تو دیکھو گے کہ گھر گھر ہے یہ
وہ ایسسمنٹ کریں گے کہ ہو جیا دوبھر
ڈوب مرنے کو بھی، پانی نہ ملے چُلو بھر
تم نے جو جوش حماقت میں کردی اپیل
سیٹ اسائیڈ بھی ہوا کیس تو تم ہو گے ذلیل
غیر ممکن ہے کہ برنسکو ملے کوئی بھی ڈھیل
یہی شعبہ ہے، ابابیلوں کا،اے لشکر فیل
ایچ ایم آر کچھ اس طرح ڈراتا ہے مجھے
" سایہ شاخ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے"
چلنے دیتے نہیں ہم لوگ کسی شے کا نظام
وہ تو حکام ہی مخلص ہیں نہ مخلص ہیں عوام
ڈھوڈتے پھرتے ہیں دیں کون سا کس کو الزام
منتظر جھانکنے والوں کے گریباں ہیں تمام
دعویٰ حُب وطن،لب پہ ہے ،دل عاری ہے
ٹیکس بچ جائے یہی فکرو عمل جاری ہے

میراوطن۔۔۔۔۔۔عاصی صحرائی

شہر خاموش ہے ہر سو اندھیرا ہے ادھر
نہ کوئی در ہے،نہ دیوار نہ سایہ ہے ادھر
جب کبھی بادِ صرصر کی صدا آئے گی
ہمیشہ سوکھے ہوئے پتوں کی ندا آئے گی
موت ہی موت ہے تا حد نظر
نامیدی نے کر لیا یاں گھر
زندگی موت کی آغوش میں سوئی ہے
رات شبنم مرے حال پہ روئی ہے
روشنی ہوتی ہے جلتے مکانوں پر
ہوس نے کرلیا ٹھکانہ ایوانوں پر
ابلیس آگیا اب میرے وطن کے زرداروں میں
یزید و فرعون جاگ اُٹھے یہاں کے جاگیرداروں میں
طالبان اب ناخدا بنے بیٹھے ہیں
شیر جنگل میں ڈرے بیٹھے ہیں
مومن نا امید ہے اس شاہ جہاں سے
مجاہد کی اذاں ملتی ہے اب ملاں کی اذاں سے

علامہ سر محمد اقبالؒ کی شادیاں.....محمد طارق غازی

علامہ اقبال نے تین شادیاں کیں اپنی پہلی بیوی سے علامہ اقبال کا مزاج ہم آہنگ نہ تھا۔وہ ایک زمیندار خاندان کی بیٹی تھی ۔علامہ اقبال نہ بطور بیرسٹر اور نہ بطور پروفیسر کامیاب ہوئے یہی وجہ کہ وہ اپنے عہد کے ریاستی حکمرانوں سے وظائف طلب کرتے رہے اس معاملہ میں وہ اور غالب ہم مزاج تھے ۔علامہ اقبال نے آکسفورڈ اور کیمرج میں بھی پروفیسر بننا چاہا مگر پذیرائی نہ ہوئی۔ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے گھریلو مالی حالت بھی بہت اچھی نہ تھی ۔اس سلسلے میں ان کے چہیتے بیٹے جاوید اقبال نے لکھا ہے کہان کی والدہ سردار بیگم جو اقبال کی منظورِ نظر تھیں بعد میں اکثر شوہر پر برہم ہوتی رہتی تھی ۔کہ وہ دن بھر گھر میں پڑے شاعری کرتے رہتے ہیں ۔اور گھر کی مالی حالت پر توجہ نہیں دیتے ۔

عطیہ فیضی سے تعلق۔

بمبئی کے شمال وجنوب میں میں پھیلی ہوئی کوکن پٹی کے شہر جنجیرہ کے نواب خاندان سے عطیہ فیضی کا بالواسطہ تعلق تھا۔نواب جنجیرہ سدی احمد خان ان کی بڑی بہن نازلی بیگم کے شوہر تھے۔نازلی بیگم اورعطیہ بیگم استنبول کے ایک ترک تاجر حاجی حسن آفندی کی بیٹیاں تھیں۔حاجی حسن آفندی بمبئی میں کاروبار کرتے تھے ۔عطیہ ،دولت مند ، خوبصورت،آزاد خیال،آزاد طبع خاتون تھیں مذہبی اصطلاح میں سماجی تیتری تھیں۔جس زمانے میں اقبال لندن میں تھے وہ بھی وہیں تھیں اور ہندوستانی طلباء کے اس گروہ سے تعلق رکھتی تھیں جو باہم ملتا جلتا رہتا تھا نیز قومی اور دیگر مسائل پر اس دور کے نوجوانوں کی طرح وقت گزاری کے لئے بحثیں کیا کرتا تھا۔عطیہ میں خود کوئی ایسی قابلیت نہ تھی جو شہرت کا باعث بنتی اسی لئے انگریزی کے جوان مرگ شاعر کیٹس کی جفا پیشہ محبوبہ فینی برآؤن کی طرح عطیہ ایسے لوگوں سے مراسم رکھتی تھی۔جن کے واسطے سے وہ تاریخ کا حصہ بن سکیں ان میں وہ دو جگہ کامیاب ہوئیں۔ایک اقبال کے ساتھ،دوسری جگہ شبلی نعمانی کے ساتھ۔شبلی نے اپنے اس تعلق پر فارسی میں بڑے شوخ اشعار بھی کہے ہیں اقبال نے اپنا بہت سا کلام نذرِ آتش کر دیا تھا۔یہ کہہ کر کہ وہ سب صرف اپنے لئے کہا تھا۔اور وہ کچھ دوسرے کو اس میں شریک کرنا پسند نہ کرتے تھے ۔وہ کلام کن شخصیات سے متعلق تھا ان سب کے نام پردہ اخفاء میں ہیں۔کہا جاتا ہے کہ عطیہ کے پاس ایک مقفل صندوقچہ تھا جسے کوئی ہاتھ نہ لگا سکتا تھا۔یہ ہمیں معلوم نہیں کہ ۱۹۶۷ء میں وفات سے پہلے انہوں نے اس مقفل صندوقچے کا کیا کیا۔اور بعد میں اس سے کیا برآمد ہوا۔اقبالیات کے عالم میرے قریبی دوست سید مصلح الدین سعدی مرحوم کہا کرتے تھے کہ عطیہ فیضی کا دعویٰ تھا کہ وہ اقبال کی محبوبہ تھی جبکہ وہ اقبال کی بس ہمراز تھیں۔اقبال کسی اور سے دل لگائے ہوئے تھے۔عطیہ کے ساتھ اقبال کے روابط میں بھی یہ بات سامنے آجاتی ہے۔کہ وہ اس ترک نژاد خاتون پر بہت اعتماد کرتے تھے۔چنانچہ لندن سے واپسی کے بعد انہوں نے چند خطوط میں اپنی پہلی بیوی کی شکایات عطیہ کو لکھیں تھیں۔یہ خطوط دراصل اقبال کی اپنی بے دلی اور ذہنی خلجان کا شاخسانہ تھے۔ان کے خطوط پڑھنے کے بعد عطیہ نے اقبال کو کسی ماہرِ نفسیات سے مشورہ کرنے کی رائے دی تھے۔یہ خطوط اقبال کی شخصی کمزوری کی دلیل تھے۔کہا یہ جاتا ہے کہ اقبال کی پہلی بیوی پرانے طرز کی خاتون تھیں جبکہ لندن کے قیام اور برطانوی طرز کی اعلیٰ تعلیم نے اقبال کے خیالات بہت حد تک تبدیل کر دیئے تھے۔فضائے مغرب نے لاکھ اقبال کو آزاد خیال بنا دیا ہو مگر وہ ۲۰۰۹ء کے نہیں ۱۹۰۹ء کے آزاد خیال تھے ۔عطیہ کی والدہ بدرالدین طیب جی کے خاندان کی ایک سلیمانی بوہرہ خاتون تھیں ان کی بہن نازلی بیگم جنجیرہ کی نواب بیگم تو بن سکتی تھیں۔مگر عطیہ بیگم خود لاہور کے علمی تو کیا ان انگریز پسند خطاب یافتہ حلقوں میں بھی بیگم اقبال کے طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں ۔جن میں اقبال کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔اس حقیقت سے اقبال بھی واقف تھے۔اور عطیہ بیگم بھی۔لہذا ان کا باہمی تعلق بہت سوچا سمجھا تھا۔یعنی دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔صرف وقت اور حالات انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آئے تھے۔ان دونوں کو پتہ تھا کہ وہ قربت کتنے فاصلے کا تقاضہ کرتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ سید مصلح الدین سعدی کا یہ خیال درست لگتا ہے کہ عطیہ اقبال کی محض ہمراز تھیں محبوبہ نہیں۔تو سوال یہ ہے کہ یورپ کے قیام کے دوران اقبال کو کس راز کے لئے ایک ہمراز کی ضرورت پیش آئی؟

جرمن ٹیوٹرایماویگناسٹ

یہ راز دار ایک جرمن خاتون تھیں۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ نے اقبال کو چھ ماہ کے لئے جرمن بھیجا تھا۔دل کا حادثہ وہیں پیش آیا ۔اقبال کو ڈگری تو میونخ یونیورسٹی نے دی تھی۔البتہ زبان سیکھنے کے لئے وہ کچھ عرصہ میونخ کے علاوہ ہائیڈل برگ میں بھی رہے جہاں ایما ویگناسٹ انہیں پڑھاتی تھی۔وہیں اقبال نے درد وفراق میں ڈوبی ہوئی دو نظمیں ''ایک شام'' اور ''تنہائی'' (بانگِ درا) کہی تھیں ان نظموں کی فضا اقبال کے دیگر تمام کلام سے بالکل مختلف ہے ۔جرمنی میں جرمن پڑھانے کے لئے دو خواتین کا تقرر ہوا تھا دوسری ایما ویگناسٹ تھیں۔جو بقول عطیہ فیضی خوبصورت اور رکھ رکھاؤ والی غیر شادی شدہ خاتون تھیں اس موضوع پر ایم اے ایچ ہوبوہم نے اپنے مقالے دل کی مراسلت میں لکھا ہے کہ اس وقت ویگناسٹ کی عمر بیس سال سے متجاوز تھی اقبال کی عمر کم وبیش تیس سال تھی۔ اقبال لاہور آنے کے بعد بھی ویگناسٹ کو خطوط لکھتے رہے۔سعید درّانی نے چند سال قبل وہ خطوط شائع کر دیئے ہیں جو انہیں ایما ویگناسٹ کی وفات کے بعد ان کی پوتی نے مہیا کئے تھے۔دل کا یہ تعلق یکطرفہ تھا ویگناسٹ کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی ۔ یہ وہ دور تھا جب اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے درمیان ناچاقی بڑھ چکی تھی۔اور انہیں فکری مصاحبت درکار تھی۔عطیہ فیضی بھی اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کوشاں تھی۔اور اقبال ایما ویگناسٹ کی شخصیت میں بھی ایک ہمدرد دوست دیکھ رہے تھے۔یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ایما ویگناسٹ کے نام اقبال کے خطوط مختصر ہوتے تھے۔اور وہ ان میں کوئی نازیبا بات نہیں لکھتے تھے۔اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اقبال اور ایما ویگناسٹ دونوں باہمی ،ثقافتی ،لسانی اور نسلی فرق کا ادراک رکھتے تھے۔اور طرفین کے تعلق کو زیادہ سے زیادہ افلاطونی محبت کے زمرے میں رکھا جاسکتا تھا۔

(دیدہ ور سہ ماہی بوسٹن امریکہ شمارہ ۸)

دہریہ.....افسانہ.....منیزہ جمال

اس نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، ملٹی نیشنل کمپنی کے پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کا اژدہام تھا وہ ابھی ابھی بس سے اُتر کر ہاتھ میں فائل تھامے یہاں تک پیدل ہی پہنچا تھا کہ کمپنی کے صدر دروازے میں داخل ہونے سے پہلے وہ ذرا رُکا، اپنے جوتوں پر جمی گرد صاف کی، قمیض کے کالر کو سیدھا کیا اور بالوں کو درست کیا اسے یہ اطمینان تھا کہ اس کی جینز پرانی ہونے اور جگہ جگہ سے مسک جانے کے باوجود اب بھی نئے فیشن سے میچ کھاتی ہے۔البتہ قمیض پر کچھ پرانے پن کے آثار محسوس کئے جاسکتے تھے۔لفٹ سے تیسری منزل کے چمکتے فلور تک پہنچا تو کاؤنٹر پر بیٹھی خوبصورت سیکٹریری نے مسکرا کر استقبال کیا۔آنے کا مقصد دریافت کیا اور نپے تُلے سوالات اس کی تعلیمی قابلیت کے متعلق پوچھے پھر ایک طائرانہ سی نظر اس کی اسناد پر ڈالتے ہوئے ایک ادائے بے نیازی سے بولی ۔آپ اپنے کاغذات چھوڑ جایئے ابھی تو ہمارے پاس کوئی ویکنسی نہیں جوں ہی کوئی جگہ خالی ہوئی ہم آپ کو کال کرلیں گے۔اپنی مترنم آواز میں وہ مسکراتے ہوئے بولی۔اور اس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمکتے رہے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سیکٹریری کے ان جملوں کا مطلب کیا ہے۔وہ جانتا تھا کہ یہ ویکنسی کبھی نہیں نکلے گی اور نہ ہی کبھی کوئی کال آئے گی، اس لمحے اچانک اسے یہ مسکراتے ہونٹ انتہائی بھدے نظر آئے۔بادلِ نخواستہ وہ بھی مسکرایا۔لیکن اس مسکراہٹ میں شکستگی تھی بالکل ویسی شکستگی جو دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کھلاڑی کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔.....کچھ ہی دیر بعد وہ اس ائرکنڈیشنڈ عمارت سے باہر تھا۔تہی دست و تہی داماں ۔۔لاچار و شکستہ دل۔۔امید کا نازک شگوفہ ایک بار پھر کھلنے سے پہلے ہی بڑی بے دردی سے مسل

دیا گیا۔.....نہ جانے ایسے کتنے ہی دفاتر میں وہ پچھلے دوسال سے درخواستیں جمع کروا رہا تھا۔اور کتنی ہی جگہ اس کا انٹرویو لیا جا چکا تھا۔ مگر ابھی تک وہ یونہی خاک چھان رہا تھا۔اور ناکامیاں مسلسل اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

ایسے ہی بچپن سے جوانی تک کی تمام تصاویر اسے کسی سینما کے پردے کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کرتی نظر آتیں۔غربت، مسائل کا انبار، حصولِ تعلیم کی مشکلات، خوشگوار مستقبل کا تصور یہ سب مناظر کبھی اس سے جدا نہ ہوتے۔لیکن اب مسلسل ناکامیوں نے جیسے اس کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔طرح طرح کی سوچیں اسے گھیرے رکھتیں، وہ خود سے بیزار رہتا، نا اُمید اور اُکھڑا اُکھڑا۔۔ان ہی سوچوں میں گُم فٹ پاتھ کے کنارے چلتے ہوئے اس کی سوچوں کے تانے بانے پھر ادھر ہی جا ملے جنھیں وہ صبح سے نہ جانے کتنی بار ذہن سے جھٹک چکا تھا۔ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ سوچتا رہا'' وہ تو مسلمان پیدا ہوا تھا، اس کے باپ دادا مسلمان ہیں تو پھر کیا حالات نے اسے خدا سے دور کر دیا؟'' وہ سوچتا رہا۔اس نے ایک گہری نظر سامنے سجی ہوئی دکانوں پر ڈالی۔اُف ! ہوش رُبا سامانِ تعیش، ماڈرن، فیشن ایبل لوگ فکر سے بے نیاز چہرے، سرسراتے لباسوں اور رنگے ہوئے بالوں والی میک اپ زدہ عورتیں اور آئس کریمیں کھاتے اور جوس پیتے توانا بچے، اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر اس انسانی اونچ نیچ کے تضاد کے خلاف چیخ اُٹھا، یقیناً اس کا کوئی مذہب نہیں، اگر ہوتا تو ماں اسے یوں [[دہریہ'' نہ کہتی۔اس کی نظروں میں آج صبح کا واقعہ گھوم گیا۔جب روز کی طرح آج بھی صبح صبح اماں نے ملازمت کی دہائی دی۔تو اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔'' وہ پوری قوت سے دھاڑا'' ہاں ہاں نہیں ملے گی مجھے ملازمت، کیونکہ ہماری قسمت میں ہی غربت لکھی ہوئی ہے، ہم غریب تھے اور ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔'' '' دیکھا دیکھا کیسی بدفال نکال رہا ہے منہ سے'' ارے خدا سے ڈر'' اماں تقریباً روہانسی ہوگئی۔'' اگر خدا ہوتا تو ضرور ہماری مدد کرتا''! میں کسی کو خدا نہیں مانتا''

'' ہائے ہائے، دیکھو تو کیسا دہریہ ہو گیا ہے یہ'' اماں نے دوہتھڑا اپنے سینے پر مارتے ہوئے آہ و بکا شروع کی، ہاں ہاں میں دہریہ ہو گیا ہوں، اس نے جھنجھلا کر پاؤں پٹخا اور زور سے دروازہ بند کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔'' ارے تجھے خدا سمجھے، جو آج یہ دن دیکھنے پڑ گئے ہائے حالات پہلے ہی کون سے اچھے تھے۔اب تو پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے ہیں۔نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جو اس کو پڑھایا لکھایا، ہائے کوئی مزدوری کر لیتا، کچھ کما کے تو لاتا، کم از کم آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا'' وہ بڑبڑاتی رہی اور سر پکڑ کے دیر تک ٹسر ٹسر روتی رہی۔کراچی کے نواحی علاقے کی ایک گندی سی بستی میں یہ بابو مسکین کا چھوٹا سا گھر تھا۔جو ریلوے میں گارڈ کی ملازمت کے آخری دور میں اچانک فالج کا شکار ہو جانے کے بعد چلنے پھرنے سے معذور ہو کر اب گھر میں کھاٹ پر پڑا رہتا، تھوڑی بہت جمع پونجی جو تھی وہ علاج معالجے کی نذر ہو گئی، اس کے سر پر ایک جوان بیٹی کا بوجھ تھا، جو ہمہ وقت اپنی جوانی کے جوار بھاٹے کو ایک ملگجی سی میلی چادر میں چھپائے رہتی جیسے تجوری میں محفوظ نادر جواہرات۔ایک یہی بیٹا تھا جو ماں باپ کی امیدوں کا سہارا تھا۔آج ان کی شبانہ روز کوششوں سے گریجوایٹ ہو چکا تھا۔گھر تو تو اس روز ہی بدحالی کی لپیٹ میں آ گیا تھا جس روز بابو مسکین پر فالج گرا تھا۔اب سارا بار بیٹے کے سر پر آن گرا تھا۔لیکن آج اسی بیٹے کی خودسری نے ماں کے دل کو چیر ڈالا تھا۔.....آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔'' چُپ ہو جاؤ اماں مت کوسو بھائی کو'' سکینہ نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں سے

لڑھک آنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ’’کیوں نہ کوسوں، آج دوسال ہونے کو آئے، دفتر کے چکر کاٹتے ہوئے، پڑھا لکھا کر کیا ملا، ایک دھیلے کی نوکری بھی نہ ملی، مجھے تو فکر کھائے جاتی ہے، جب آج یہ حال ہے تو کل کیا ہوگا، اور اوپر سے تیرا پہاڑ جیسا بوجھ میری جان ہلکان کئے جا رہا ہے‘‘ یہ کہتے ہوئے اماں نے اپنی بے قصور بیٹی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا اور بھوں بھوں کر کے رونے لگیں۔ وہ آج صبح کے واقعہ کے متعلق سوچتے ہوئے ایک بار پھر متفکر ہو گیا کہ ماں کو کیا جواب دے گا؟ آج پھر بغیر نوکری کے خالی ہاتھ گھر کی جانب لوٹ رہا تھا جیسے ایک ہارا ہوا جواری شکستہ قدموں سے بے نشاں راستوں کی جانب چلا جا رہا ہو، اونچے اونچے خوبصورت بنگلوں اور اس کی بستی کے بیچ ایک گندا نالہ حائل تھا۔ بستی تک پہنچنے کے لئے اس نالے پر رکھے گئے چوڑے سیمنٹ کے تختے کو عبور کرنا پڑتا تھا، اسے بچپن سے ہی اس بدبودار نالے سے چڑ تھی۔ جسکے اس طرف بیماری تھی، غربت تھی، جہالت تھی کسمپرسی اور بے بسی تھی اور دوسری جانب زندگی کا حُسن تھا اور وہ ہر چیز تھی جس کی کوئی بھی انسان خواہش کر سکتا ہے اس وقت اس گندے نالے کو عبور کرتے ہوئے اس کی سماعتیں گنگ ہو گئیں۔ اس کے نتھنوں میں نالے کی اذیت ناک بُو گھسے جا رہی تھی، گویا اس کی لاچاری اور بے بسی کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ اس کے دماغ میں پراگندہ خیالات کی بھرمار ہو گئی، یوں جیسے کوئی معصوم بچہ بھرے بازار میں اپنی ماں سے بچھڑ جائے اور دیوانہ وار اسے تلاش کرنے کے لئے چہار سُو بھاگنے لگے۔ وہ بھی اپنا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے درست سمت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک بار پھر اس کی سماعتوں نے سنا ’’دہریہ، دہریہ، دہریہ‘‘ اسے اپنے باطن کی دنیا ایک مختلف سمت لئے جا رہی تھی۔ ایک ہلچل، ایک اضطراب اس کے اندر بپا تھا

۔۔۔۔ شاید وہ خود کو کھوج رہا تھا۔۔ شاید خود کو اپنے اندر کہیں تلاش کر رہا تھا۔۔۔ گندے نالے کو عبور کر کے وہ کچی پکی گلیوں سے بے مقصد گزرتا گیا۔ یہ اُس کی اپنی بستی تھی۔ لیکن آج وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا، کچھ دور جا کے ایک مسجد کے سامنے بنی ایک چوکی پر ٹِک گیا، گلی کے تنگ دھڑنگ بچے شور مچاتے دوڑ بھاگ رہے تھے۔ خوانچے والے اپنی اپنی آوازیں لگاتے گزر رہے تھے۔ اس نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا یہ وہ نوٹ تھا جو اس کی بہن اور ماں نے محلے کی عورتوں کے کچھ کپڑوں کی سلائی کے عوض کمایا تھا بھوک سے اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ گھر سے وہ ویسے ہی ناراض ہو کر نکلا تھا اور صبح سے بالکل بھوکا پیاسا تھا سامنے سے چھوٹے سے ہوٹل سے گرما گرم تندوری روٹیوں اور سالن کی اشتہا انگیز خوشبو دعوت طعام دے رہی تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا، نوٹ واپس جیب میں رکھا تا کہ کل پھر بس پکڑ کر ایک بار پھر ملازمت کی تلاش میں نکلے۔ مجبوری اور بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اسی دل گرفتگی کی عالم میں اسے اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا، یہ مسجد کے مولانا تھے، جب وہ پیدا ہوا تھا تب سب سے پہلے اس مولانا نے ہی اس کے کان میں اذان دی تھی۔ ’’بیٹا میں تمہاری پریشانی سمجھتا ہوں ہم ایک ہی محلے کے باسی ہیں مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں، سُن رہے ہو تم بیٹے؟؟؟ مولوی صاحب نے پیار سے اسکا کندھا ہلایا۔ ’’جی جی ہاں‘‘ میں منمنایا۔ ’’تم نے اس مسجد کی دہلیز پر کبھی قدم نہیں رکھا، پوچھ سکتا ہوں بیٹے کیوں‘‘؟ ’’شاید میں مسلمان نہیں‘‘ ’’یا شاید میں باغی ہوں‘‘ ’’آج سے نہیں بچپن سے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا دنیا میں ناانصافی اور ظلم ہی دیکھ رہا ہوں‘‘

’’’’نہیں بیٹے تم باغی نہیں، بلکہ تم جذبات سے لبریز کلمہ گو نوجوان ہو ،تم خود کو دھوکہ دے رہے ہو‘‘’’تم خودغرض ہو میرے بیٹے‘‘ ذرا اپنی ذات کے خول سے باہر نکلو،اس کے لئے تمہیں یقین کی قوت درکار ہوگی وہی تمہیں ان اندھیروں سے نکالے گی۔‘‘’’یعنی کوئی معجزہ رونما،اور میری تقدیر بدل جائے گی ہوگا‘‘۔اس کا انداز استہزائیہ تھا۔’’یقیناً اللہ کی طرف سے آنے والی مدد ایک معجزے کی طرح آتی ہے۔مگر صرف یقین کی قوت سے!مایوسی کفر ہے۔جب انسان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔سو جب اللہ کسی کو ہدایت دینا چاہے تو بندے کو بالکل اسی طرح منتخب کرتا ہے جیسے بارش کا قطرہ سیپ کو!مولانا مضبوط لہجے میں کہتے رہے اور وہ سنتا رہا۔۔۔آج پہلی بار کسی نے اس کے قلب کے تاروں کو یوں چھیڑا تھا کہ ان سے جو لطیف سُر پھوٹ رہے تھے۔آج تک وہ خود بھی ان سے واقف نہ تھا۔لاؤڈ اسپیکر کی آواز خاصی تیز تھی۔اللہ اکبر کی صداؤں میں اب مولوی صاحب کی آواز دور سے آتی محسوس ہورہی تھی آج اس پر زندگی نئے انداز سے منکشف ہورہی تھی اس نے جوتے اُتارے اور وضو خانے کا رُخ کیا۔اگلی صبح بابو مسکین کھاٹ پر پڑا کھانس رہا تھا۔اور اماں اسے دودھ پلا رہی تھی،سکینہ اپنی بوسیدہ چادر میں لپٹی،پہاڑ جیسے دن کا بوجھ اُٹھانے کی تیاری کررہی تھی۔کہ بھائی کے بستر پر نظر پڑی،وہ وہاں نہ تھا،باہر سے کچھ مدھم مدھم شور کی آوازوں پر سکینہ نے آگے بڑھ کے دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا،اس کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں،گندے نالے سے کچھ دور کھلی جگہ میں برگد کے درخت کی چھاؤں میں بستی کے بے شمار بچے اور بڑے بیٹھے سامنے کھڑے بھائی کی مترنم آواز کی لے میں اپنی آواز ملا کر عجب سماں باندھ رہے تھے۔ یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

جو قلب کو گرما دے روح کو تڑپا دے

تبصرہ کتب: زکریا ورک،ٹورنٹو کینیڈا

ڈاکٹر عبدالسلام کی نئی سوانح از مجاہد کامران

پچھلے سال جنوری 2013ء میں لاہور سے پروفیسر مجاہد کامران کی کتاب دی انسپائیرنگ لائف آف عبدالسلام یونیورسٹی آف پنجاب کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔کتاب نہایت دیدہ زیب،مجلد، سفید کاغذ،عمدہ چھپائی اور تصاویر کی حامل ہے۔جیکٹ پر ڈاکٹر سلام کی تاریخی تصویر ہے۔کتاب کے مندرجات کچھ اس طرح ہیں: تعارف،بچپن،گورنمنٹ کالج لاہور،کیمبرج میں طالبعلم،پاکستان کا دورہ، پی ایچ ڈی سٹوڈنٹ، لاہور واپسی، کیمبرج میں لیکچرار، امپرئیل کالج میں، الیکٹرو یک اتحاد اور نوبیل پرائز، دیگر سائنسی تحقیقات،سائنس اور مذہب، پاکستان سائنس اور تعلیم،آئی سی ٹی پی،عبدالسلام بطور طبیعات دان اور عظیم انسان،سلام کے سوانحی کوائف، میٹرک سے لیکر ماسٹرز تک تعلیمی امتحانات کے نتائج، کتابیات،اور اشاریہ۔

1982ء سے لیکر آج تک ڈاکٹر سلام کی عالیشان زندگی پر چار قابل ذکر سوانح عمریاں شائع ہوچکی ہیں۔یعنی ڈاکٹر عبدالغنی،جگجیت سنگھ،گورڈن فریزر،اور مجاہد کامران۔یہ سب سوانح عمریاں انگلش میں ہیں۔اردو میں ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب کا اردو ترجمہ تورینہ قاضی نے کیا تھا۔اسی طرح اردو میں چوہدری عبدالحمید کی سوانح بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ضرورت ہے کہ انگلش کی تمام سوانح عمریوں کے تراجم اردو میں کئے جائیں تا اس مہر درخشاں،فخر پاکستان کی زندگی سے اردو دان طبقہ بھی متمتع ہوسکے۔راقم کی تین کتابوں میں ڈاکٹر سلام کی شاہکار زندگی اور عہد ساز کارناموں کی جھلک ان کے دوستوں، رفقاء،شرکاء کار، شاگردوں، ان کے

اساتذہ، اور سائنسدانوں کے مضامین میں ملتی ہے۔ مجاہد کامران اس کتاب کی اشاعت سے قبل ڈاکٹر سلام کی زندگی پر متعدد مضامین ضبط تحریر میں لا چکے ہیں۔ ان کو ڈاکٹر سلام کا شاگرد رشید ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ گورنمنٹ کالج میں وہ سلام چیئر کے حامل رہ چکے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جیسے جدید طبیعات کے بانی۔ ڈاکٹر سلام کی خواہش تھی کہ وہ ان کی سوانح عمری لکھیں چنانچہ یہ کام بہ طریق احسن سرانجام پا گیا ہے۔ 1985ء میں ان کو عبد السلام پرائز ان فزکس دیا گیا تھا۔ اس وقت آپ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ اپنی ذات میں ایک تسلیم شدہ سائنسدان، سلام کے شاگرد اور قلم کار ہونے کے ناطے ان ہی کو زیب دیتا تھا کہ وہ اپنے مینٹر اور ذیشان استاد کے حالات زندگی کو قلم بند کریں۔ سوانح کی سب سے منفرد بات جو دیگر سوانح عمریوں میں نہیں ہے وہ سلام کے میٹرک سے لیکر ماسٹرز تک کے امتحانات یعنی 1940ء سے لیکر 1946ء تک کے حاصل کردہ نمبروں کی یونیورسٹی آف پنجاب کی اصل فہرست ہے۔ اس زمانے میں تمام امتحانات پنجاب یونیورسٹی کے زیر نگرانی ہوتے تھے۔ اتنے پرانے کاغذات کو تلاش کرنا جان جوکھوں کا کام تھا مگر ڈاکٹر کامران یہ کام کر دکھایا ہے۔ مجاہد کامران کی یہ سوانح ایک جامع کتاب ہے جس میں سلام کی کامیابیوں کے ہمراہ ان کی بعض ایک ناکامیوں اور مایوسیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے سلام کے ساتھ اپنی گفتگو اور مختلف النوع سائنسی موضوعات پر تبادلہ خیال سلام کے آئیڈیاز کا ذکر کیا ہے۔ کتاب میں سلام کی زندگی کے بہت دلچسپ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو گزشتہ سوانح عمریوں میں بھی بیان ہو چکے ہیں۔ چونکہ راقم الحروف تمام گزشتہ سوانح عمریوں کا مطالعہ کر چکا ہے بلکہ میرے پاس گھر میں موجود ہیں اسلئے کوئی نیا واقعہ سامنے نہیں آیا۔ البتہ ایک نیا باب اس کتاب میں سلام بہ حیثیت طبیعات دان اور انسان شامل ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ بہ حیثیت طبیعات دان ڈاکٹر سلام کے بارہ میں کہا جاتا تھا کہ His nose always points in the right direction۔ ڈاکٹر کامران نے 1990ء کے گرمیوں کے موسم میں سلام سے پوچھا ان کی فیلڈ میں کرنٹ آئیڈیاز کے بارہ میں ان کی چھٹی حس کیا تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ یقیناً اس وقت سپر سمٹری میں بالضرور کوئی چیز تھی، ممکن ہے ہائی انرجی فزکس میں یہ ہمیشہ ہی ہوگی۔ سلام کے شاگرد ڈیل بورگو Delborgough نے بڑی دل چسپ بات مشاہدہ کی تھی کہ کس طرح ریاضی کی مدد کے بغیر کسی مسئلہ کے ٹھیک ہونے کے بارہ میں اندازہ لگا لیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: کسی مسئلہ کے فائن پوائنٹ پر اگر آپ ان کیساتھ گفتگو کرنے کیلئے ہمت باندھتے تو آپ کو سو فی صد مطمئن ہونا لازمی تھا کہ آپ کیا کہنے والے ہیں کیونکہ ڈاکٹر سلام کو مسئلہ کا جواب وہبی طور پر معلوم ہوتا تھا، اور اکثر ایسا ہوتا کہ انکا جواب بجائے غلط ہونے کے درست ہوتا تھا۔ بددل ہو کر اگر آپ ان کا سامنا کرتے اور پوچھتے کہ آپ اپنے جواب سے کیوں اس قدر پر یقین تھے،، تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی، ہاتھ کے انگھوٹوں کو دائرے میں گھماتے، کرسی میں پیچھے ہو کر نیم دراز ہو جاتے، انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر اشارہ کر دیتے۔ ہاں ایسا بھی ہوتا کہ اگر آپ میدان نہ ہارتے، اور اگر کسی موقعہ پر بادل نخواستہ صحیح ہوتے، تو وہ آپ کا احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر سلام کسی بھی شخص کو اپنی علمیت پر شیخی بگھارتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

پروفیسر برٹاچی Bertocci ڈپٹی ڈائریکٹر آئی سی ٹی پی کا کہنا ہے کہ 1956ء کے موسم خزاں میں ان کو سلام کے اس لیکچر کے ہاتھ سے لکھے نوٹس کی نقل بھجوائی گئی جو انہوں نے راجسٹر میں دیا تھا۔

یہ نوٹس سلام کے مخصوص سٹائیل میں تھے بلکہ فارمولے اگر چہ ان کا آغاز اور فائینل ریزلٹ تو صحیح تھے مگر درمیان کے صفحات غلطیوں سے بھرے تھے۔ یہ سلام کا مخصوص انداز تھا کہ فزکس یا دیگر علوم میں اہم نقاط کو اٹھالیں، ان پر محتاط رنگ میں نظر ڈالیں، غیر اہم نقاط کو نظر انداز کر دیں بشرطیکہ فائینل ریزلٹ ٹھیک ہو۔ پروفیسر گورڈن فیلڈ مین Feldman کا کہنا ہے کہ: عبدس نہ صرف اپنے آئیڈیاز کے بارہ میں بلکہ جب وہ کسی چیز کے بارہ میں پڑھتے جن کا ان کو علم نہ ہوتا تھا جذباتی ہو جاتے تھے بشرطیکہ بیان کردہ آئیڈیا خوبصورت ہوتا۔ ایک دفعہ وہ میرے دفتر میں بنا بتائے آ گئے اور بلیک بورڈ پر چھوٹی سی لکیر کھینچ دی جس کے دونوں طرف دائرے تھے۔ جوش اور جذبات جوان کی آنکھوں میں نمایاں تھے انہوں نے کہا یہ SU(3) ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے اور پال (میتھیوز) کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہے تھے۔ برٹاچی کہتے ہیں کہ سلام کیلئے مطالعہ کرنا اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ تخلیق کرنا۔ ڈاکٹر سلام نے اختر سعید کو 1987ء میں انٹرویو لاہور میں ریکارڈ کروایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک نئی قسم کا حساب سیکھ رہے تھے جس کو فزکس میں اس سے پہلے استعمال نہیں کیا گیا تھا یعنی Reiman surfaces۔ ہم اس کا مطالعہ کر رہے ہیں اور یہ بہت مشکل ہے کیونکہ ہمارا مقابلہ 24 سالہ نوجوانوں سے ہے۔ دیکھیں آپ 24 سالہ جوانوں سے مقابلے میں ہیں جن کے پاس اور کچھ کرنے کو نہیں۔ وہ جوان ہیں، ان کے جسم لچکدار اور اسکے علاوہ ان کو کچھ اور کرنے کو نہیں۔ یہ نقطہ اہم ہے جبکہ ہمیں ہر قسم کے دیگر کام کرنے ہوتے ہیں۔ جب انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ آیا انہوں نے نظری طبیعات میں اپنا تحقیقی کام ختم کر دیا ہے۔ انہوں نے جوابدیا: کام کیسے ختم کر سکتے ہیں، انسان کس طرح کام روک سکتا ہے، ختم کرنا موت کے مترادف ہے۔ یہ شاعری کی طرح ہے کیا شاعر مر جاتے ہیں؟، شاید ایسا ہی ہے۔

اختر سعید نے استفسار کیا آپ کو اپنے تخلیقی کام میں کوئی نا امیدی ہوئی ہے؟ انہوں نے جوابدیا: سب سے بڑی نا امیدی یہ ہے کہ میرے پاس فزکس میں تحقیقی کام کیلئے خاطر خواہ وقت نہیں۔ یہ سب سے بڑی نا امیدی ہے۔ تھرڈ ورلڈ کے تمام طبیعات دانوں کی طرح ہماری سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے قوم وملت کیلئے کچھ کریں۔ یہ سب سے بڑی نا امیدی ہے جو ہماری کام کو متاثر کرتی ہے۔ (کامران صفحہ 258/59 اس انٹرویو کا سی ڈی CD اختر سعید سابق ایجوکیشن سیکرٹری نے از راہ تلطف مجاہد کامران کو فراہم کیا تھا)۔ جن دنوں آپ اٹلی میں سلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس قائم کرنے اور مستحکم کرنے کے کام میں از حد مصروف تھے تو وہ اکثر ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر میں ہوتے تھے۔ جیسا کہ شاگرد ڈیل بورگو کے خیال میں یہ کہنا بعید نہیں ہے سلام اپنا تحقیقی کام یا تو سفر کے دوران یا جہاز پر کرتے تھے۔ جب تک ان کا جسم ان کو سپورٹ کرتا رہا سلام تخلیقی کام میں مصروف رہے۔ جس فلسفہ پر وہ زندگی گزارتے تھے اس کا عملی اظہار وہ یوں کرتے تھے کہ کام ختم کر دینا مر جانے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر کارلو روبیا Rubia نے 'عبد السلام اینڈ سرن' کے عنوان سے ہونیوالے سیمینار جو سلام کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا ستمبر 1997ء میں کہا: عبدس کا رول سرن کے پروگراموں کے متعلق اہم تھا خاص طور پر SPC کے ممبر ہونے کے ناطے سے۔ LHC & CLIC جیسے سائنسی نام سات افراد کی لانگ رینج پلاننگ کمیٹی میں وضع کئے گئے تھے۔ کمیٹی کی میٹنگز میں ہیڈ ران اور لے نیئر کولائڈرز کی امکانی طاقت کو پرکھا جاتا تھا۔ سرن کے مستقبل کے متعلق سلام کا ویژن، جوش اور صفائی ان کو

zakaria.virk@gmail.com

☆

خوب یاد تھی۔ میرے خیال میں انہوں نے سرن کے اگلے بیس سال کو بہت بڑے اہم طریق سے ڈیفائین کیا ہے۔ سلام کو تمام دنیا کے 46 تعلیمی اداروں کی طرف سے D.Sc Honoris Cause کی ڈگری دی گئی تھی۔ اسی طرح سلام متعدد سائنسی اداروں کے آنریری فیلو تھے جیسے سویٹ اکیڈیمی آف سائنسز، امیریکن ایکڈیمی آف آرٹس اینڈ سائنسز۔ ان کو متعدد انعامات دئے گئے بشمول نوبیل پرائز کے جس کی تمنا ہر قابل سائنسدان کرتا ہے۔ دنیا کے پانچ بر اعظموں (ماسوا آسٹریلیا اور انٹارٹیکا) سے ان کو آنریری ڈاکٹریٹ دی گئیں تھیں۔ سلام 275 سائنسی مقالوں کے مصنف یا شریک مصنف تھے، اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائیگی۔ پچھلے سال نومبر 2013ء میں لاہور میں کچھ روز کے قیام کے دوران کتاب خریدنے کیلئے تین چار دکانوں پر جانا پڑا۔ اگر کتاب کو لاہور کے متعدد بک اسٹورز پر مہیا کردیا جائے تو خریداروں کو آسانی ہو جائیگی۔ تا دم تحریر Amazon پر یہ دستیاب نہیں ہے۔ ایک پاکستانی کی طرف سے یہ بے مثل، دیدہ زیب، پر از معلومات، دلچسپ کتاب ڈاکٹر سلام کو خراج عقیدت ہے خاص طور پر ایک ماہر تعلیم کی طرف سے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ پنجاب میں سکولوں کی نصابی کتابوں میں ڈاکٹر سلام کا نام پھر بحال کرنے کی کوشش کریں گے۔ ڈاکٹر سلام اول و آخر پاکستانی تھے۔ ان کو پاکستانی شہریت پر فخر تھا۔ اس چیز کا اظہار وہ تمام عمر کرتے رہے۔ اس دھرتی جو ان کو پیار تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ جس دھرتی میں انہوں نے جنم لیا اسی کی خاک میں وہ آسودہ ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے اس کتاب کو ایک لفظ میں کیسے بیان کریں گے؟ تو میں کہوں گا انسپائرنگ۔